



شہید آیت اللہ مرتضیٰ امپہری کی
ایک لاجواب تقریر کا خلاصہ



مترجم

ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی

فہرست

صفحہ	شہید کی عظمت
۳	شہید کی حق سے وابستگی
۴	شہید کا حق انسانیت پر
۶	شہید کے جسم پاک کی اہمیت
۷	فلسفہ شہادت
۹	بھاد
۱۵	شوق شہادت
۱۹	شہید کی منطق
۲۱	شہید کا خون
۲۱	شہید کی کارنامہ سازی
۲۱	شہید زندہ و جاوید ہوتا ہے
۲۲	شہید شافع ہوتا ہے
۲۲	شہید پر رونے کی تلقین
۲۴	شہید پر رونے کا فلسفہ
۳۳	قبر شہید کی اہمیت
۳۴	شب عاشور
۳۵	امام حسینؑ نے اہلبیت اور اصحاب پر اپنی حجت تمام کی
۳۹	امام حسینؑ کے دو سرمایہ خوشحالی

مقدمہ

یہ کتاب شہید آیت اللہ مطہری کی ایک لاجواب تقریر کا ترجمہ ہے جسے آپ نے شب عاشورہ ارشد فرمایا تھا۔ اگرچہ اس تقریر کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے لیکن یہ اس تقریر کا اردو میں پہلا ترجمہ ہے جو ناظرین گرامی مخصوصاً نوجوانوں کے استفادہ کی خاطر آسان اور مثبت اردو میں کیا گیا ہے۔

قارئین محترم اس کتاب کے مطالعہ سے اس نتیجہ کو حاصل کریں گے کہ شہید مطہری نہ صرف ایک باہر مقرر بلکہ فارسی ادب کے معروف ادیب، بڑے مجتہد اور اسلامی علوم کے مشہور فلاسفر تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے تمام لمحات کو حقیقی کپلے خون کے آخری قطرے کو بھی سلامِ حریت وقف کر دیا تھا۔ آپ کی ناگہان شہادت اسلام کے لیے غمناک اور بیعیان جہان کے لیے خصوصاً بہت بڑا نقصان تصور کی جاتی ہے۔

آپ کی کوئی تین سو جلد کتابیں ابھی تک شائع کی گئی ہیں اور ابھی کوئی بیس جلد کتابیں عوام کے استفادہ کے لیے چھاپی جا رہی ہیں، بعض مشہور کتابوں کا انگریزی، عربی، اردو اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

آپ کی مشہور کتاب ”داستان راستان“ کو یوٹو آرگنائزیشن آف ورلڈ کی جانب سے سال ۱۹۶۵ء کی بہترین کتاب قرار دیا گیا۔

شہید مطہری کی شخصیت ناٹپا امام خمینی کے ان جملوں سے ظاہر ہوتی ہے جنہیں آپ نے

مرحوم کی شہادت پر بیان فرمایا۔ ”میں نے ایسے پیارے فرزند کو جو میرے دل کا ٹکڑا تھا کھو دیا ہے وہ میری زندگی کا ٹھکانہ تھا اور حقیقت بھی یہی ہے جس کا اقرار خود شہید مطہری نے اپنی متعدد کتابوں میں کیا ہے کہ ان کی تمام تحلیلات اور تحقیقات ان کے استاد نائیک امام خمینی کے فیض و برکت کی وجہ سے ہیں۔

بندہ کو اس مقام پر فخر حاصل ہے کہ اسلامی دنیا کے ایک بڑے فلاسفر، ادیب اور مجتہد کی ایک چھوٹی سی تقریر کا ترجمہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، اگرچہ میں نہ کوئی اُردو ادیب کا ادیب ہوں اور نہ فن ترجمہ کا ماہر لیکن اس امر و شواہد کی کوشش کی تاکہ ناظرین محترم اس بڑے دانشمند کے خیالات اور افکار سے واقف ہو جائیں۔ مطلب کو حتی الامکان آسان اور عام الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، چنانچہ اگر ادب یا انشاء کی غلطی پیش آئے تو نظر انداز فرمائیے گا۔ اگر خداوند عالم کی توفیق برقرار ہے تو انشاء اللہ جلد ہی دوسری کتابوں کے ترجمہ کو تائین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

میں اس مقام پر ساز و آرائش اسلامی شعبہ روابط بین الملل کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی محنتوں اور محبتوں نے اس کام کو جامعہ عمل پہنچایا۔

والسلام علی من اتبع الهدی

ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تَحْبَبَ الْكَذِبَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَانًا لَّيْلًا عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْفَعُونَ

شہید کی عظمت

دنیا کی نظر میں عموماً اور مسلمانوں کی نظر میں خصوصاً بعض الفاظ یا کلمات مقدس اور عظیم تصور کیے جاتے ہیں۔ جیسے عالم، مجتہد، استاد، فلسفی، عابد، زاہد، مجاہد، مومن، صدیق، مہاجر و انصاری، امام، بنی وغیرہ وغیرہ یہ الفاظ لفظ ہونے کی وجہ سے عظمت و احترام کے حامل نہیں بلکہ اپنے معنی اور مفہوم کی بنا پر عظیم اور مقدس سمجھے جاتے ہیں۔

دنیا کے تمام اجتماع اپنے لیے تقدسات اور برکات کے قائل ہیں جو ایک دوسرے سے اپنے انداز فکر، طرز بیان اور نتائج میں اختلاف رکھتے ہوئے بھی اپنی جگہ خود ایک فلسفیانہ اور طویل بحث ہیں۔ جو افراد مکتب اسلام سے آشنا ہوں اور قوانین مفاہیم اسلامیہ کو اچھی طرح سے جانتے ہوں، وہ اس امر کا بخوبی احساس کرتے ہیں کہ شہید ایک لفظ معظم اور منور ہے جس کو نور کی شمعیں احاطہ کئے ہوئے ہیں، یہ لفظ تمام ادیان اور اقوام کی نظر میں مقدس اور عظیم سمجھا جاتا ہے، اگرچہ اس کے معیار اور ضوابط میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اسلام کی نظر میں جب کوئی شخص درجہ شہادت پر فائز ہوتا ہے تو اسلام اُسے اپنے معیار اور قواعد کے تحت شہید کہتا ہے یعنی اگر کوئی فرد، خدا کی راہ میں، مقاصد اسلامی کی خاطر اور انسانیت کی ابرو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جان فدا کر دیتا ہے تو اسلام اُسے عالی ترین درجات اور مراتب سے نوازا کرتا ہے۔ تفسیر قرآن، تعبیرات احادیث اور روایات اسلامی جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں وہ لفظ شہید کے مقدس اور عظیم ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

شہید کی حق سے وابستگی

قرآن مجید شہید کی حق سے وابستگی کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے :-
 وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
 خیال نہ کرنا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے ہیں وہ ”مردہ“ ہیں بلکہ وہ ہمیشہ ”زندہ“
 ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق حاصل کرتے رہتے ہیں۔

دین اسلام میں کسی شخصیت کی تعریف یا اس کے کام کی قدر و منزلت کو بتلانا ہوتا ہے کہ جسے
 فلاں شخصیت کا مقام شہید کے برابر ہے یا فلاں شخصیت نے جو نیک کام کیا ہے اس
 کا ثواب شہید کے ثواب کے مساوی ہے۔ مثال کے طور پر طالب علم حقیقی جس کا مقصد صرف عوام کی
 خدمت اور تقرب خدا ہوا اور علم کو اپنے حرص اور طمع کا وسیلہ نہ بنائے تو اس کی بابت ارشاد ہوتا
 ہے کہ اگر یہ علم حاصل کرنے کے دوران مرجائے تو اس کو دنیا سے شہید اٹھے گا۔

یہ مسئلہ دین اسلام میں علم کی قدر اور طالب علم کی منزلت کو آشکار کرتا ہے۔ اسی طرح جس
 نے اپنے گھر کے کاروبار اور اپنے اہل و عیال کے مسائل کو حل کرنے کے لیے محنت اور مشقت
 برداشت کی ہو اگرچہ اسلام نے اس کو ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے کیونکہ اسلام بیکاری اور کاہلی
 کا سخت مخالف ہے، تو اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: اَلْكَافُ لِعِبَادِهِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
 جو شخص اپنے اہل و عیال کے لیے محنت اور زحمت کرے اور مشقتیں اٹھائے اس مجاہد
 کی طرح ہے جو خدا کی راہ میں جہاد کر رہا ہو۔

شہید کا حق انسانیت پر

دنیا کی تمام شخصیتیں جنہوں نے کسی بھی طریقہ سے انسانیت کی خدمت کی ہو، انسان
 کی گردن پر اپنا حق اور احسان رکھتی ہیں مثلاً کسی نے علم، کسی نے فکر و فلسفہ، کسی نے صنعت و کاروباری

کسی نے ایجاد اور کسی نے اپنے اخلاق اور حکمت عمل کے ذریعہ انسان کی خدمت کی ہے (تو انسانیت پر اس کے حقوق ہیں)۔ لیکن کسی بھی نامور شخصیت نے شہید کی طرح انسانیت پر اپنا حق اور احسان نہیں رکھا، شاید یہی وجہ ہے کہ حق شناس اور مجتہد انسان نے شہید کو ایک خاص مقام اور اس کی شہادت کو ایک خاص جذبہ اور احترام کے ساتھ قبول کیا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ شہید دل کا حق اور ان کا احترام دوسری شخصیتوں کی نسبت زیادہ اور عظیم ہے؟ ہاں! اس کی دلیل ہمارے پاس موجود ہے (دیکھئے تمام ایسے اشخاص، جنہوں نے بشریت کی خدمت کی ہے، شہیدوں کے شکر گزار ہیں لیکن اس کے برخلاف شہداء ان کے شکر گزار نہیں کیونکہ یہ ایک امر مسلم ہے کہ ایک عالم اپنے علم میں، ایک فلسفی اپنے فلسفہ میں، ایک استاد اخلاق اپنے درس اخلاق میں ایک آزاد اور سازگار معاشرے کا محتاج ہے تاکہ اپنی خدمات کو انجام دے سکے لیکن شہید بالکل اس قسم کے اجتماع سازگار کا محتاج نہیں کیونکہ شہید اپنی زندگی کو فدا کر کے، اپنے بدن کو خاک و خون میں غلٹا کر کے انسانیت کے لیے چراغ ہدایت نصب کرتا ہے۔

شہید کی شخصیت کو ایک شمع سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کا محبوب شعلہ خود کو جلا کر، خود کو فنا کر کے روشنی اور نور کو پھیلاتا ہے تاکہ بشر اس نور اور روشنی کی بدولت اپنی زندگی کے کاروبار کو اچھی طرح سے انجام دے سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہداء بزم انسانیت کی شمع ہیں جن کا کام فنا کر کے انسانیت کی محفل کو روشن کرنا ہے کیونکہ اگر یہ محفل اندھیری رہ جائے تو انسان کوئی بھی مثبت کام انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن افسوس کہ انسان دن میں آفتاب کی روشنی کی بدولت یا رات میں چراغ کے نور کی بدولت زندگی کے کاموں کو مکمل کرتا ہے، ہر مسئلہ پر غور و فکر کرتا ہے لیکن اس مبداء نور یعنی آفتاب یا چراغ پر توجہ نہیں دیتا، اگر یہ نور اور روشنی نہ ہوتی تو تمام کام نامکمل اور ناتمام رہ جاتے، لہذا معلوم ہوا کہ شہداء نور اور روشنی کے تابناک مجسمے ہیں، اگر ان کا نور

اور روشنی نہ ہوتی تو ظلم و جبر کی تاریکی انسان کو تمدن تک پہنچنے ہی نہ دیتی۔
 خُداوند عالم نے سورہ احزاب میں اپنے حبیب پیغمبر اکرم کو ”سراج منیر“ کہہ
 کر پکارا ہے یعنی چراغ نورانی۔ ارشاد ہوتا ہے: **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ
 شَهِيدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۚ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا
 مُنِيرًا ۝**

اسے پیغمبر ہم نے تم کو بھیجا ہے گواہ بنا کر، اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور باذنِ خدا
 دعوت دینے والا حق کی طرف اور نورانی اور درخشاں چراغ بنا کر اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانانِ
 جہان جنھوں نے تہذیب اسلام کو اپنا یا بے لفظ شہید اور اس کے مفہوم کو دوسرے کلمات کے
 نسبت باعظمت سمجھتے ہیں، یعنی لفظ شہیدان کے ذہنوں میں ایک لفظ مقدس اور نورانی ہے۔

شہید کے جسم پاک کی اہمیت

اسلام دین حکمت و منطق ہے۔ تمام احکامات اسلام حکمت و منطق، اور راز و نیازِ بشر
 سے بھر پور ہیں۔ ان احکامات کے مطابق اگر کوئی مسلمان مر جائے، تو دوسرے مسلمانوں پر واجب
 ہے کہ اس کی میت کو غسل و کفن دے کر اس پر نماز میت پڑھیں اور کبیرہ دفن کریں، لیکن اس
 حکم میں ایک استثناء ہے اور وہ ہے شہید!۔ یعنی شہید کے بارے میں حکم ہے کہ صرف نماز پڑھ کر
 اُسے دفن کریں غسل و کفن کی مطلقاً ضرورت نہیں چونکہ شہید کی روح کا مرتبہ اتنا بلند و بالا ہے
 کہ اس کے ارش سے شہید کا بدن پاک اور اس کا پہنا ہوا لباس اگرچہ خون میں غلطاں ہو طاہر اور پاکیزہ رہتا
 ہے شہید کا جسم ایک ”نہن پاک“ ہے یعنی شہید کا جسم روح کی طرح لطیف اور پاک ہے۔ جس طرح
 روح کے لیے غسل و کفن لازم نہیں اُسی طرح جسدِ شہید کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں،
 چنانچہ اسی لیے شہید کو جس نے خُدا کی راہ میں اپنا سر پیش کیا ہے، غسل و کفن دینے بغیر خاک و خون

سے بھرے ہوئے لباس میں دفن کیا جاتا ہے۔
یہ احکامات فقہ اسلامی میں مخصوص ہیں جو دین اسلام میں شہید کا مرتبہ اور اس کی منزلت کو
بتلاتے ہیں۔

فلسفہ شہادت

شہادت میں، شہید کا مقام صرف قتل ہونے کی وجہ سے اہمیت کا باعث نہیں بنتا اس
دُنیا میں ہر روز کئی افراد کسی مقصد کے بغیر مفت قتل کیے جاتے ہیں جنہیں عام زبان میں ان افراد
کی بدقسمتی اور تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس طرح کے مرنے سے انہیں کوئی امتیاز یا افتخار
حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس قسم کی موت ذلت اور حقارت کا باعث ہوتی ہے۔

اس مقام پر ضروری سمجھنا ہوں کہ موت کو واضح طور پر بیان کروں جیسا کہ ہم سب جانتے
ہیں کہ موت یا انتقال کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ موت طبعی: انسان اپنی عمر کے مراحل کو طے کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ اُس
کا بدن زندگی کے فرائض یا امور کو ٹھیک طریقہ سے انجام نہیں دے سکتا اور آخر کار اس دُنیا سے
فانی سے کوچ کرتا ہے جسے ہم موت طبعی کہتے ہیں۔ ایسی اموات قابل امتیاز ہوتی ہیں اور
قابل ملامت اور ان پر لوگ بھی زیادہ افسوس نہیں کرتے۔

۲۔ موت کی دوسری قسم۔ موت اخترامی یا ہلاکت ہے یہ موت غمگین کنندہ اور دوسروں کے
لیے افسوس کا باعث ہوتی ہے جو عموماً بیماریوں مثلاً ہیضہ، طاعون، ملیریا وغیرہ یا فحشاء
مثلاً زلزلے، سیلاب، طوفان وغیرہ کی وجہ پیش آتی ہے۔ یہ اموات قابل امتیاز یا قابل ملامت
نہیں سمجھی جاتیں، بلکہ ان اموات کو ان افراد کی تقدیر یا بدقسمتی کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ موت کی تیسری قسم کسی بے گناہ کا قتل ہے یعنی مقتول بے گناہ ہوتا ہے اور قاتل صرف
اپنے فائدہ یا حسد کی خاطر مقتول کو اپنا نشانہ بنا لیا ہے اس قسم کے واقعات کو ہم ہر روز اخباروں،

اور رسالوں میں پڑھتے ہیں کہ فلاں عورت نے اپنے سوتیلے بچے کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا کہ اُس کا شوہر اس بچے کو بہت پیار کرتا تھا، یا فلاں شخص نے اپنی معشوقہ کو شادی سے انکار کرنے پر قتل کر دیا۔ تاہم انہیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ فلاں حکمران نے اپنے تمام فرزندوں کو اس لیے تیغ کے گھاٹ اُتار دیا کہ آئندہ بغاوت کا اندیشہ نہ رہے۔

اگرچہ ایسا غمگین کنندہ اور افسوس کا باعث ہوتی ہیں لیکن انہیں مقتول کے لیے کسی قسم کا امتیاز یا افتخار نہیں سمجھا جاتا۔ چونکہ اس طرح کی موت میں مقتول بے گناہ اور بے خبر ہوتا ہے دوسری طرف دنیا قاتل کو نفرت اور غصہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے جس نے صرف اپنے فائدہ اور حدود و عدالت کی بنا پر ایک بے گناہ کو تیغ کیا۔

۴۔ موت کی چوتھی قسم قتل خود یا خود کشی ہے۔ خود کشی مفت جان کھولنے کا نام ہے۔ لوگ اس کو ملامت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ عمل گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ٹریفک کے حادثے میں جو لوگ اپنی غلطی کی وجہ سے مارے جاتے ہیں خود کشی کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۵۔ موت کی پانچویں قسم ”شہادت“ ہے جس میں انسان تمام خطرات زندگی کو جانتے ہوئے مقصد اور ہدف کو پچھاننے کی خاطر راہِ خدا میں اپنی جان فدا کرتا ہے اور درجہ شہادت پر فائز ہوتا ہے۔

شہادت کے دو پہلو ہیں یعنی اول شہید مقصد اور ہدف کو پچھاننے کے لیے خدا کی راہ میں، صرف خدا کے لیے اپنی جان کو فدا کرے، دوسرے شہید کو اس کا علم ہو کہ وہ اس عمل میں اپنی جان کھو بیٹھے گا۔ بعض اوقات قاتل کسی شخص کو اس کے عمل خیر سے روکنے کے لیے جو خدا کی راہ میں فی سبیل اللہ مقتول ہو دھوکہ سے اپنا نشانہ بناتا ہے۔ اگرچہ مقتول یہاں بے خبر ہوتا ہے لیکن یہ عمل شہادت ہے اور قابل احترام بھی ہے (

شہادت میں جو نیک شہید اچھی طرح سے جانتا ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اپنی جان کو مقصد اور ہدف کے لیے قربان کر دے گا اس لیے شہادت کو ایک عمل شجاعانہ اور مردانہ تصور

کیا جاتا ہے اور ایسی اموات زندگی سے بہتر اور محترم و مقدس سمجھی جاتی ہیں۔

اس مقام پر بہت ہی افسوس کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر ذاکرِ یرضیٰ سید الشہداء علیہ السلام جنہیں ان مسائل کی زیادہ خبر نہیں یا جو دیکھ آنحضرت کو شہید کے مقدس نام سے یاد کرتے اور انہیں سید الشہداء کہتے ہیں۔ لیکن بے علمی کی وجہ سے شہادت سید الشہداء کو ایک قتل بے گناہ بتلاتے ہیں یعنی معاذ اللہ امام حسینؑ کی زندگی مفت ایک پلید کے ہاتھوں تمام ہوئی اسی طرح بہت سے عرب اور ان حسینی صرف امام کی مظلومی و بیچارگی اور بے دخلتی پر گریہ کرتے ہیں یعنی انہیں صرف اس کا افسوس ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت ایک چھوٹے معصوم بچے کے قتل کے مانند تھی جسے قاتل نے اپنی ہوس اور حسادت کی خاطر مار ڈالا۔

اگر شہادت سید الشہداء فقط قتل بے گناہ ہو جس میں امام حسینؑ کی کوئی بھی دخالت نہ ہو تو یہ فقط قتل بے گناہ ہے لیکن شہادت نہیں! تو پھر کس طرح سے امام حسینؑ سید الشہداء کہلائے جاسکتے ہیں۔ دُقرانی امام حسینؑ محض جاہ طلبی اور ایک ملعون کی ہوس تھی! اس کی کوئی شک نہیں کہ قاتلانِ امام مظلوم ظالم، جاہ طلب سحر بیس اور مکار تھے، لیکن جس مقصد کے لیے انہوں نے حسینؑ کو اپنا نشانہ بنایا وہ امام حسینؑ کے مقصد کی پائیداری اور اسلام کی پاسداری تھی۔ وہ حسینؑ سے بیعت چاہتے تھے لیکن حسینؑ نے تمام عواقب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی نہ نقطہ اس مطالبہ کو قبول نہیں کیا بلکہ اس پر اعتراض کیا اور خاموشی کو گناہ عظیم سمجھتے ہوئے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تاریخ کا دامن امام کے خطبوں سے بھر پور اور امام کی شجاعت کا گواہ ہے۔

تو معلوم ہوا کہ شہادت ایک بلند و بالا و تار و درجہ ہے، جسے شہید آگاہانہ طور پر مقصد کو پہچاننے کی خاطر تمام زندگی و ہستی کو مناکر حاصل کرتا ہے۔

جہاد

دین اسلام خدا کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لیے جنگ کرنے کے عمل کو جہاد کے نام

سے موسوم کرتا ہے موتِ حیات اور وقت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہاں جہاد کے مسائل اور اس کے احکامات کے بارے میں زیادہ بحث نہیں کر سکتے کہ آیا جہاد میں حملہ کیا جاتا ہے یا صرف دفاع۔ اگر جہاد دفاع کا نام ہو تو دفاع شخصی اور قومی مد نظر رکھا جائے یا اجتماعی؟ تاکہ آزادی و عدالت بشر جزو دفاع اجتماعی نہیں۔ توحید جزو آزادی و عدالت بشر ہے یا نہیں اور بنیادی طور پر جہاد حق آزادی کے منافی ہے یا نہیں۔

بہر حال یہ تمام بحثیں جالب اور مفید ہیں لیکن جہاد کی کتاب میں بیان کی جانی چاہیے فعلیاً یہاں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ اسلام ایسا مذہب نہیں کہ جس شخص نے ایک طمانچہ کھایا ہو اس کو دُوسرا خسار پیش کرنے کا حکم دے اور زالیبا دین ہے جو کہے کہ خدا کا کام خدا کرے اور شاہ کا کام شاہ یعنی خود کو ایک عضوِ مصل کی طرح انک تھک رکھے، مسائلِ اسلام راز و نیاز اجتماع سے بھر پور ہیں اور اسلام نے دفاع کی کوشش کو لازم قرار دیا ہے۔

قرآن کریم میں کئی آیات تین معانی میں مقدسہ ”ایمان“ ”ہجرت“ اور ”جہاد“ کو تعریف میں نازل ہوئی ہیں، قرآن کی روشنی میں انسان واقعی ایمان سے سرشار ہو اور ایمان کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرے چنانچہ یہی انسان بالایمان اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے اور بچانے کے لیے ہجرت کرتا ہے اور اجتماع کے ایمان کی حفاظت اور اس کے بچانے کے لیے جہاد کرتا ہے۔ وقت یہاں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آیات قرآن و روایات جو اس ذیل میں ارشاد ہوئی ہیں بیان کر دوں، لیکن نہج البلاغہ سے چند جملے اس امر کو روشن کرنے کے لیے کافی سمجھتا ہوں۔ حضرت علی فرماتے ہیں: (إِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللَّهُ لِمَنْ أَحْلَاهُ)

جہاد ایک ایسا دروازہ جنت ہے جس کو خداوند عالم نے ہر شخص کے لیے نہیں کھولا۔ یعنی ہر شخص اُس مقام و منزلت تک نہیں پہنچ سکتا کہ خدا اُس پر جہاد کا دروازہ کھولے، یا ہر شخص کی قسمت نہیں کہ وہ ”مجاہد“ بنے۔ خداوند عالم اپنے لطف و کرم سے یہ عنایت مخصوص دوستوں کو عطا کرتا ہے۔ مجاہد کی منزلت ”اولیاء اللہ سے اونچی ہے مجاہد کا شمار

”خاصۃً اویا اللہ“ یعنی خاص دوستینِ خدا کی صف میں کیا جاتا ہے۔

قرآن فرماتا ہے جنت کے آٹھ دروازے ہیں لیکن جنت کو ان آٹھ دروازوں کی کیا ضرورت؟ آیا یہ دروازے خدا نے اس لیے بنائے ہیں کہ روزِ محشر جنت میں داخلہ کے لیے ہجوم نہ ہو، لیکن خدا کو اس چیز کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ خدا فرماتا ہے وَهُوَ سَمِیعُ الْحِسَابِ یعنی اللہ ایک لحظہ کے اندر اندر تمام بندوں کے حساب کو کھنکھلاتے کرے گا۔ جنت کے دروازہ پر ہجوم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ وہاں صف بندی کا مسئلہ پیش ہوگا۔

تو کیا خدا نے ان دروازوں کو تعارف کی خاطر بنا رکھا ہے کہ امراء اور فضلاء ایک دروازے سے اور غریب و مساکین دوسرے دروازے سے جنت میں داخل ہوں، لیکن ہم ابھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ درجہ بندی وہاں نہیں، پھر شاید لوگوں کے مشاغل کے تحت آٹھ دروازوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی یعنی اُستاد و معلم ایک دروازے سے، تاجر دوسرے، مزدور و فقیہ تیسرے دروازے سے جنت میں داخل ہوں، لیکن یہ ایک امر مسلم ہے کہ خدا اجر، تقویٰ اور ایمان بندوں میں فرق ہی نہیں کرتا چنانچہ سب مطالب غلط ہوئے۔ خدا کے نزدیک درجات کی اہمیت ہے۔ یہ درجات انسان دنیا میں اپنے عمل و ایمان اور تقویٰ کی بدولت حاصل کرتا ہے جس کسی نے اپنے ایمان و عمل و تقویٰ کو زیادہ کیا اس کا درجہ بھی اُسی قدر عالی ہوگا اور اُسی نسبت سے اُس پر جنت کے دروازے کھولے جائیں گے، چنانچہ جس دروازے سے مجاہدین اور شہداء جنت میں داخل ہوں گے وہ دروازہ مخصوص دوستانِ خدا کے لیے بنایا گیا ہے۔

ایک اور مقام پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں: وَهُوَ لِبَاسُ التَّقْوَىٰ جہادِ تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ روح اور اخلاق کی پاکیزگی، خود شنائی اور خود غرضی سے دُور رہنے کا نام ہے۔ مجاہد واقعی تقویٰ کی منازل میں عام متقیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ کوئی شخص متقی ہو اس لیے کہ وہ حد نہیں کرتا دوسرا غور سے پاک ہے تیسرا حرص سے اور

چوتھا بخل وغیرہ سے لیکن مجاہدان سب سے پاکیزہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی کی بازی لگا دی ہے چنانچہ اسی لیے جنت کے دروازے جو مجاہدین پر کھولے جاتے ہیں تمام متقیوں سے الگ ہیں۔

آیا تقویٰ اور متقین خداوندِ عالم کے نزدیک درجات اور مراتب کے حامل ہیں؟ قرآن کی روشنی میں معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے لَئْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ شَوْا اتَّقَوْا وَآمَنُوا شَوْا اتَّقَوْا وَأَحْسِنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ :

جنھوں نے ایمان لایا اور عمل صالح انجام دیئے اور نعمتِ دنیا کو استعمال کیا وہ ان کا حق ہے ہمیشہ تقویٰ و ایمان و عمل صالح کو ایسے نزدیک رکھیں اور بعد اس کے ایمان اور تقویٰ اور پھر تقویٰ اور احسان پر کاربند رہیں اللہ محسنین کو پسند کرتا ہے۔ اس آیت قرآن نے دو مسائل کو واضح کیا ہے۔ پہلے جس پر کہ ہم بحث کر چکے ہیں ایمان اور تقویٰ درجات اور مراتب کے حامل ہیں۔ دوسرے انسان کی زندگی کا مقصد اور انسان کا حق کیا ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ ہم نے نعمتیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں اور انسان کو ایمان اور تقویٰ اور عمل نیک کے لیے خلق کیا ہے۔ یعنی انسان صرف اُس وقت نعمت خدا کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے جبکہ وہ ایمان و تقویٰ و عمل صالح کی راہ پر گامزن ہو۔ علماء اسلام نے آیات قرآنی، روایات اور ارشادات اسلامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقویٰ کی درجہ بندی کی ہے تقویٰ عام، تقویٰ خاص اور تقویٰ خاص الخاص۔

مجاہدین کا تقویٰ، تقویٰ خاص الخاص ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے تمام اختیارات کو سبکدخاں میں سجا کر بارگاہ حق میں پیش کر دیا ہے دوسرے مقام پر حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

وَدِرْعُ اللَّهِ الْحَصِينَةُ وَجَبَّتُهُ التَّوَشِيَةُ

جہاد خدا کی دی ہوئی ایسی ذرہ ہے جسے کوئی قدرت پھاڑ نہیں سکتی اور خدا کی دی ہوئی ایسی ڈھال ہے جسے کوئی طاقت کاٹ نہیں سکتی۔ سچ ہے اگر ملت مسلمان جس کی روح جہاد کی مشاق ہو، خدا کی دی ہوئی ذرہ کو پہن کر، خدا کی دی ہوئی ڈھال ہاتھ میں تھام لے تو کوئی بھی دنیا کا حملہ انھیں شکست نہیں دے سکتا۔ ذرہ اس لوہے کے لباس کو کہتے ہیں جسے ایک سپاہی جنگ کے وقت پہنتا ہے اور ڈھال اس شے کو کہتے ہیں جسے سپاہی اپنے پیٹھ میں تھام کر دشمن کے حملہ کو روکتا ہے، ذرہ کا کام جسم کی حفاظت کرنا ہے جبکہ ڈھال کا کام حملہ کو روکنا ہے۔ شاید اسی لیے حضرت علیؑ نے جہاد کو ذرہ اور ڈھال سے تعبیر کیا ہے کیونکہ بعض جہاد و اجتماع کی حفاظت اور بعض دشمن کے حملوں کو بے اثر کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔

حضرت علیؑ ان لوگوں کی مذمت میں جنہوں نے جہاد سے راہ فرار اختیار کی ہے فرماتے ہیں۔
 مَنْ تَرَكْ رَغْبَةَ الْبَسَةِ اللَّهُ لِبَاسِ الذُّلِّ - وَشَمَلَةَ الْبُلَاءِ
 وَدَيْتَ بِالْضَّغَارِ وَالْقَمَاءِ وَضُرِبَ عَلَى قَلْبِهِ بِالْأَسْدَادِ وَأَدِيلَ الْمَحَقِّ مِنْهُ
 بِالنَّصِيحِ الْجَهَادِ وَسَيِّمِ الْخُصْفَ وَمُنِيعَ النَّصْفِ -

جن افراد نے بغیر کسی خاص دلیل کے جہاد سے منہ موڑ لیا ہے خدا انھیں ذلت اور ملامت کا لباس پہنوا تا ہے اور انھیں حقارت کی گھرائیوں میں پھینک دیتا ہے اور ان کے قلب کی روشنی پر تاریک پردے ڈال دیتا ہے اور ان سے ادب و عالی سوچنے کی فکر کو لے لیتا ہے۔ حکومت ان کو میٹھے ہوئے امتیازات اور عنوانات واپس لے لیتی ہے اور آخر کار سخت مصیبتوں اور مشقتوں میں پھنس جاتے ہیں اور کوئی قدرت ان کے حق کی بابت انصاف بھی روا نہیں رکھتی۔

اس مقام پر حضرت علیؑ نے جہاد سے دوری کرنے کے نقصانات کو بتلایا ہے جو ایک

یاد و افراد کے لیے نہیں بلکہ اس جملہ سے صاف واضح ہے کہ یہ مسائل اجتماع و معاشرہ کے فوائد کے لیے کیے گئے ہیں۔ جہاد سے فرار کے نقصانات کا اس طرح خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ جو ملت جہاد سے منہ موڑ لیتی ہے وہ دنیا کی نظر میں ذلیل اور خوار رہتی ہے۔
- ۲۔ جو افراد جہاد سے دوری کر کے سمجھتے ہیں کہ آسائش کی زندگی بسر کریں گے، حقیقت میں وہ ذلت اور عذاب کی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔

۳۔ ان افراد کی روح ہمیشہ میت اور حقیر رہے گی۔

۴۔ مکتب اسلام قلب کی روشنی اور عالی سوچ کی کیفیت کو مکمل خالص کی دین سمجھتا ہے چنانچہ اسی لیے جہاد اجتماع کے لیے ایک حکم عمل ہے اور اگر کوئی اس عمل کو انجام نہ دے تو حضرت علیؑ کے ارشاد کے مطابق قلب کی روشنی اور انجنا سوچنے کی کیفیت کو کھو بیٹھتا ہے۔

- ۵۔ جنہوں نے جہاد سے راہ فرار اختیار کیا ہو انہیں پرچہ دار اسلام یا منادی اسلام کہنے کا حق ہی نہیں ہوتا اور یہ حق ان سے واپس لے لیا جاتا ہے۔

۶۔ جن افراد نے جہاد کو ترک کیا ہے وہ دوسروں سے اپنا حق بھی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ جب تک ایک ملت مجاہد ہو، دوسری اقوام اس کا احترام کرتی ہیں اور اس کا حق دینے کے لیے مجبور ہوتی ہے، لیکن اگر کسی ملت نے اس خاصیت کو کھو دیا ہو تو پھر دوسری ملتیں نہ تو ان کے احترام کی قائل ہوتی ہیں اور نہ انکے بارے میں انصاف کرتی ہیں بہر حال یہ تمام مصیبتیں اور ذلتیں جہاد سے کنارہ کشی کا نتیجہ ہیں۔

شاید اسی لیے رسول اکرمؐ نے فرمایا: **الْخَيْرُ كُلُّهُ فِي السَّيْفِ وَتَحْتَ خَيْلِ السَّيْفِ**؛ خیر اور برکت تلوار اور اس کے سایہ میں ہے پھر فرماتے ہیں: **إِنَّ اللَّهَ أَعَزُّ أُمَّتِي بِسَابِلِ خَيْلِهَا وَمَنْ لَحِزَ رِمَاحُهَا**۔

خداوند عالم نے میری امت کو گھوڑوں کی ٹاپوں اور نیزوں کی بدولت عزیز رکھا۔ یعنی

امت محمدی امت مقصد اور ہدف ہے اور دین اسلام دین قدرت اور مجاہدہ کا۔
 ویل دورانت اپنی کتاب تاریخ اور تمدن میں "لکھتا ہے۔ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح
 اپنے پیروں کو قدرت اور طاقت کی طرف نہیں پکارا۔
 ایک اور حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ مَنْ لَمْ يُغْزِ وَلَمْ يُحَدِّثْ لِنَفْسِهِ لُغْزًا عَلَى شِعْبَةٍ مِنَ النَّفَاقِ
 جس نے جہاد نہ کیا ہو اور آرزو جہاد بھی اس کے دل تک نہ پہنچی ہو تو وہ حسرت میں
 مرے گا۔ گویا اس کے دل میں نفاق کا کوئی ذرہ ہے یعنی اسلام انسان کو جہاد یا کم از کم
 آرزو جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔

کسی نے پیغمبر اکرم سے سوال کیا مَا بَالُ الشَّهِيدِ لَا يُفْتَنُ فِي قَبْرِهِ شَيْئًا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ
 سوال وجواب نہیں کیا جاتا ہے۔ پیغمبر نے فرمایا كُنْ بِأَلْبَابِ رَقَّةٍ فَوْقَ رَأْسِهِ فَتَنَةٌ
 شہید نے جس وقت تلوار کی دھار اس کے سر کو کاٹ رہی تھی امتحان کی منزل میں تمام جوابات کو
 ادا کیا یعنی شہید نے اپنی صداقت اور وعدہ و نفا کی کو ظاہر کر دیا اور اسی لیے عالم قبر و برزخ میں
 اس کے لیے کوئی سوال وجواب کا موقع باقی ہی نہیں رہا۔

شوق شہادت

پیغمبر اکرم کے دور حیات میں ایک خاص قسم کا جذبہ اہلبیت اصحاب اور انصار میں دیکھا
 جاتا تھا جس کو جذبہ شوق شہادت کہا جاسکتا ہے، جس میں حضرت علیؑ کی شخصیت ہمیشہ پیش پیش
 نظر آتی ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

الْوَأَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكَوَأَنْ يَتُوبُوا آمَنَّا وَهُوَ لَا يُفْتَنُونَ
 تو میں جان گیا کہ جب تک رسول خدا ہمارے درمیان ہیں کوئی فتنہ نازل نہ ہوگا۔ میں
 نے رسول خدا سے سوال کیا کہ یہ فتنہ کیا فتنہ ہے، پیغمبر نے فرمایا یا علیؑ میری زندگی کے بعد امت
 اس فتنہ سے دوچار ہوگی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ جب تک اُحد میں جب دوسرے مسلمین شہادت

کے درجہ پر فائز ہوئے اور میں شہادت سے محروم رہا، تب آپؐ نے مجھے ایک خوشخبری دی تھی اور فرمایا تھا کہ تیری شہادت آئندہ ہوگی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا ہاں میں نے ٹھیک کہا ہے اور تمہارے شہادت آگے آئے گی پھر پیغمبرؐ نے فرمایا۔ اچھا علیؑ بتلاؤ شہادت کے وقت کیونکر صبر کرو گے تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ وہ صبر کا مقام نہیں بلکہ شکر گزاری کا وقت ہوگا۔

اسے کہتے ہیں جذبہ شوق شہادت۔ علیؑ شہادت کی اُمید میں زندگی گزار رہے تھے اگر یہ اُمید علیؑ کی زندگی سے نکال لی جاتی تو علیؑ کی زندگی میں رونق ہی باقی نہ رہتی اور زندگی علیؑ کے لئے ایک بے معنی چیز بھجورہ جاتی۔

ہم لوگ زبان سے تو بہت علیؑ علیؑ کرتے ہیں اور شاید عمل کیے بغیر زبان سے علیؑ کی مدح کرنے میں ہم سے شیعہ ترویدیاں کوئی نہ ہوگا، لیکن حقیقی شیعیت دانِ اِشاد آپؐ سب لوگ شیعہ ہوں گے، علیؑ کے ساتھ علیؑ کی راہ پر چلنے کا نام ہے جو بہت مشکل کام ہے اور جہاد اس کا صرف ایک نمونہ ہے۔

حضرت علیؑ کی شخصیت کو چھوڑیں، دوسرے اشخاص کو دیکھیں جن کے دل اس جذبہ شوق شہادت سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ان کے دلوں میں صرف ایک ہی آرزو تھی اور وہ شہادت تھی۔ ائمہ اطہار کی دعائیں جو ہم تک پہنچی ہیں فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ بَرِّحْمَتِكَ فِي الصَّالِحِيْنَ فَاَدْخِلْنَا، وَفِي عَلِيٍّ فَاَرْفَعْنَا وَقَتْلًا فِي سَبِيلِكَ مَعَ وَلِيِّكَ فَوْقَ لَنَا

اے اللہ اپنی رحمت کے تصدق ہمیں صالحین میں داخل فرما اور علیؑ کا مقام عطا فرما اور ہم کو تو فتن عطا فرما کہ ہم تیرے دوست کے ساتھ تیری راہ میں شہید ہوں اور ہمیں شہادت کا درجہ عطا کرے۔ اس شوق شہادت کو ہم جوانوں میں بڑھوں میں سفیدوں میں، سیاہوں میں، بہر حال تمام مومنوں میں دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ پیغمبرؐ کی خدمت میں آکر التماس کرتے تھے کیا راہِ اِشاد دے دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں شہید ہوں اور خدا ہمیں درجہ شہادت سے سرفراز فرمائے۔

کتاب ”سفینۃ البحار“ میں ایک شخص بنام خثیمہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ باپ اور بیٹے میں

شہادت پر فائز ہونے کے لئے کیونکہ بحث و جھگڑا ہوا۔ راوی لکھتا ہے جب جنگ بدر پیش آئی تو اس شخص اور اس کے بیٹے میں بحث شروع ہوئی کہ کون جنگ پر جاوے اور کون گھر کی دیکھ بھال کرے۔ باپ نے بیٹے سے کہا کہ میں جنگ پر جاؤں گا اور تو گھر کی دیکھ بھال کر، بیٹے نے جواب دیا۔ نہیں۔ تو گھر میں بیٹھا اور میں جنگ پر جاؤں گا۔ جب اس بحث و مباحثہ سے نتیجہ نہ نکلا، تو انھوں نے قرعہ کشی کی اور قرعہ میں پسر کا نام نکلا، چنانچہ وہ جنگ میں لڑ کر شہید ہو گیا۔

کچھ عرصہ نہ گزر سکا کہ باپ نے اپنے جوان بیٹے کو خواب میں دیکھا کہ بہت خوش ہے اور درجاتِ عالیاں کو عطا کیے گئے ہیں۔ بیٹے نے باپ سے کہا خدا نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا وہ سچا اور درست تھا اور خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا ہے دوسرے دن وہ شخص رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب کو بیان کر کے کہنے لگا یا رسول اللہ! اگرچہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری ہڈیاں کمزور اور سست ہو گئی ہیں لیکن مجھے شہادت کی بہت آرزو ہے۔ دعا کیجئے کہ خدا مجھے شہادت کا شرف عطا فرمائے۔ پیغمبر اسلام نے دعا فرمائی کہ خداوند عالم اس بندہ مومن کو شہادت سے سرفراز فرما۔ چنانچہ ایک سال کا عرصہ نہ ہوا تھا کہ جنگ اُحد پیا ہوئی اور یہ شخص شہید ہوا۔

دوسرا واقعہ ایک شخص بنام عمرو بن جوح کا ہے ایک پیر سے معذور ہونے کی وجہ سے جہاد کا حکم اس پر جاری نہیں ہوتا تھا۔ جب جنگ اُحد پیش آئی تو یہ شخص اپنے بیٹوں کے ساتھ جنگ کو جانے کی تیاری کرنے لگا، بیٹوں نے منع کیا لیکن اس نے دُستی قید کے بڑے لوگوں کو جمع کیا گیا انھوں نے بھی منع کیا لیکن اس نے سب کی بات رد کر دی، بالآخر یہ افراد پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئے تب اُس شخص نے کہا یا رسول اللہ! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میرے بچے مجھ کو شہید ہونے سے منع کریں، اگر شہادت ایک خوب چیز ہے تو میرے لئے بھی خوب ہوگی، میری تنہا آرزو یہی ہے کہ میں خدا کی راہ میں شہید ہوں۔ رسول خدا نے اس کے بیٹوں

امام حسینؑ کو بلا کے راستہ میں حضرت علیؑ کے فرمائے ہوئے اشعار پڑھتے رہتے تھے۔

فرماتے ہیں۔ فان تكن الدنيا تعد لنفسية
وان تكن الاموال للنزك جمعها
وان تكن الابدان للموت النشات
فدار ثواب الله اعلیٰ وانبل
فما بال متروك له المرمي خل
فقتل امرء بالسيف في الله اجل

اگرچہ کہ دنیا زیبا اور دلکش ہے جو انسان کو اپنی طرف کھینچی ہے لیکن خدا کی بتلائی ہوئی آخرت دنیا سے زیادہ خوبصورت اور بلند و عالی ہے۔
جب مال دنیا کو چھوڑ جاتا ہو تو کیوں انسان اس مال کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرے۔ اگر ہمارے جسم اس لیے بنائے گئے ہوں کہ ایک دن مر جائیں تو خدا کی راہ میں کیوں تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوں جو (موت سب سے) بہتر ہے۔

شہید کی منطق

ہر شخص اور ہر گروہ اپنے لیے ایک خاص طرز فکر کا حامل ہے اور اسی فکر کی بنا پر وہ اپنے لیے حدود اور معیار مقرر کرتا ہے اور چنانچہ انہی حدود اور معیار کی روشنی میں وہ اپنے انجام دیئے ہوئے افعال و اعمال کی جانچ اور ان کی قدر و منزلت سے آگاہ ہوتا ہے۔
شہید کی طرز فکر یا شہید کی منطق کو عام لوگوں کی منطق سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ شہید کی طرز فکر کا مقام بلند اور خاص خصوصیت کا حامل ہے۔ شہید کی منطق ایک طرف عشق خداوندی ہے بھرپور اور دوسری طرف معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔
شہید کی طرز فکر کو وجود میں لانے کے لیے ہمیں دو قسم کے افکار کو یکجا کرنا پڑے گا یعنی ایک رہنما کی طرز فکر جو اجتماع اور عوام کی خدمت کے لیے ہو اور ایک زاہد کی طرز فکر جو صرف عشق خداوندی عالم سے سرشار ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں جب امام حسینؑ نے کوفہ کا رخ کیا تو اُس دور کے عقلمندوں اور سیاستدانوں نے امام کو اس سفر سے منع کیا۔ ان کی نظر میں امام حسینؑ کا یہ کام منطقی نہ تھا اور ان کے لحاظ سے حقیقت بھی یہی تھی کیونکہ ان لوگوں کی طرز فکر یہاں ان کی منطق ایک عام انسان کی منطق تھی جو صرف اپنے مفاد اور حفاظت پر مشتمل تھی۔ ان کی منطق سیاسی تھی اور اس کی روشنی میں امام کا یہ امر منطقی نہ تھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ امام حسینؑ کی منطق ایک شہید کی منطق تھی اور شہید کی منطق عوام کی منطق سے عالی ہوتی ہے۔

عبداللہ ابن عباس اور محمد ابن حنفیہ معمولی انسان نہ تھے بلکہ ان کا شمار اُس دور کے بڑے
سیاست دانوں اور روشن فکروں میں کیا جاتا تھا، چنانچہ ان کی طرز فکر کے مطابق جو صرف حفاظت
مفاد اور شکست دشمن پر مشتمل تھی، امام حسینؑ کا کوفہ کی طرف سفر کرنا عقلمندی کا کام تصور نہیں
کیا جاتا تھا چنانچہ اسی لئے ابن عباس نے امام کو مشورہ دیا کہ کوفہ کی عوام کو خط لکھیں کہ اگر حقیقت
میں حسینؑ ابن علی کے طرف دار ہیں تو یزیدی امراء اور منصب داروں کو کوفہ سے باہر نکال
دیں اور کوفہ میں امن و امان قائم کریں۔ چنانچہ اگر کوفہ کے لوگوں نے یہ کام کیا تو آپ ضرور شریف
لے جائیں اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تمام لیں اور اگر انھوں نے اس کام
کو انجام نہ دیا تو پھر کوفہ کا رخ نہ کریں۔

امامؑ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں ضرور جاؤں گا تو ابن عباس
نے کہا۔ آپ شہید کر دیئے جائیں گے امام نے جواب دیا، شہادت میری میراث ہے۔
ابن عباس نے سوال کیا تو پھر شہید اپنے اہل و عیال کو تو ساتھ نہیں لے جاتا یا تو امامؑ نے فرمایا اہل و عیال
کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔

سچ ہے کہ شہید کی طرز فکر، شہید کی منطق، عام انسانوں کی فکروں سے جدا ہوتی ہے شہید
کی فکر اپنے آپ کو فنا کر کے بزم انسانیت کو روشن کرنا ہے، اس کی فکر اپنے آپ کو مٹا کر کے اجتماع
کی رگوں میں جوش لانا ہے۔ اُس کی فکر اپنی روح کو بدن سے آزاد کر کے انسانیت کے پرہیزگار
بدن میں روح چھونکنا اور اس کو زندہ کرنا ہے۔ اس کی فکر آئینہ سلیم کی رہنمائی اور انکو راہِ راست
پر لانا ہے۔

اسی لئے لفظ شہید ایک لفظ نورانی ہے۔ جس کے اطراف میں نور کی شعاعیں طواف
کرتی رہتی ہیں، یہ لفظ دوسرے الفاظ کی نسبت مقدس اور عظیم ہے اور کوئی بھی لفظ اس لفظ
کے مقام و مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

شہید کا خون

شہید کیا کرتا ہے، شہید کا کام صرف یہی نہیں کہ دشمن کے مقابل کھڑے ہو کر دشمن کو واصل جہنم کرے یا خود کو دشمن کی تلوار کی نذر کرے۔ اگر شہید فقط یہی کام کرے تو جس وقت دشمن کی تلوار شہید کے خون کو زمین پر بہائے تو کچھ کہتے ہیں کہ شہید کا خون رائیگاں بہ گیا۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔

کسی بھی وقت شہیدوں کا خون رائیگاں اور ضائع نہیں ہوتا۔ شہید کا خون زمین میں جذب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا ہر قطرہ، ہزاروں بلکہ لاکھوں قطروں میں تبدیل ہو کر، ایک دریا کو جسے شکل اختیار کر کے معاشرے کے بدن میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا۔ کوئی بھی قطرہ خدا کے نزدیک اُس قطرہ خون کی نسبت جو راہ خدا میں بہایا جائے بہتر اور قابلِ مقابلہ نہیں۔ شہادت معاشرے کے نجف بدن کو خون دینے کا نام ہے۔ یہ شہدائیں جو معاشرے کی سوکھی رگوں کی اپنے خون سے آبیاری کرتے ہیں۔

شہید کی کارنامہ سازی

شہید کارنامہ ساز ہوتا ہے شہید کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی کارنامہ سازی اور شجاعت ہوتی ہے۔ جن اقوام کی روح، خدا کی راہ میں شجاعت دکھلانے اور کارنامہ سازی کرنے میں پشورہ ہو جاتی ہے، شہید اپنی شہادت کے ذریعہ ان میں جان ڈالتا ہے لہذا دین اسلام ہمیشہ شہید کا مخرج ہے کیونکہ ہمیشہ کارنامہ سازی اور شجاعت کی ضرورت رکھتا ہے۔

شہید زندہ جاوید ہوتا ہے

ایک عالم اپنے علم کی بدولت سوسائٹی کی خدمت کر کے معاشرے سے منسلک ہوتا ہے،

چنانچہ اجتماع (معاشرہ) کو اس کے علم کی بدولت قد و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یعنی عالم اپنے شخصیت کے صرف ایک پہلو یعنی اپنی فکر و اندیشہ کی بدولت اجتماع (سوسائٹی) کی خدمت کر کے اپنی شخصیت کو زندہ جاوید کرتا ہے۔

موجد اپنی ایجاد کی بدولت سوسائٹی کی خدمت کرتا ہے اور اجتماع سے منسلک ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے فن و ہنر و صنعت کی بدولت اجتماع کی خدمت کرتا ہے اور اجتماع (معاشرہ) اس کے فن و ہنر کی وجہ سے زندہ جاوید ہوتا ہے۔

ایک استاد اخلاق، اپنے فلسفہ اخلاق کو سینہ بہ سینہ اپنے شاگردوں میں منتقل کر کے اجتماع میں اپنے نام کو زندہ جاوید کرتا ہے۔

لیکن شہید اپنے خون اور اپنے تمام وجود کی بدولت معاشرے میں اپنے آپ کو زندہ جاوید کرتا ہے۔ یعنی وہ اجتماع کی رگوں میں زندہ خون کو پیدا کرتا ہے۔

بالفاظ دیگر جو اپنی طرز فکر کو زندگی جاودا بنی دیتا ہے وہ عالم یا فلسفی ہے، جو اپنے فن و ہنر و صنعت کو زندگی جاودا بنی دیتا ہے وہ فنکار یا موجد ہے۔ جو اپنی حکمت عملی اور رہنمائی کے ذریعہ معاشرے کی خدمت کرتا ہے وہ رہبر یا استاد اخلاق ہے لیکن شہید اپنے خون کو بیکہ حقیقت میں اپنے تمام وجود کو زندگی اور جاودا بنی دیتا ہے۔ شہید کا خون ابدیت تک اجتماع کی رگوں میں جوش مارتا رہے گا۔

پس ہر شخصیت یا گروہ صرف اپنے ایک پہلو کو زندگی دیتا ہے، لیکن شہید اپنے تمام پہلوؤں اور اپنے تمام وجود کو زندگی بخشتا ہے۔ اسی لئے پیغمبرؐ نے فرمایا۔

فَوْوَكُلِّ ذِي بَرٍّ حَتَّى يُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَإِذَا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَيْسَ فَوْقَهُ بَرٌّ

ایک نیکی دوسری سے بڑھ کر اور دوسری، دوسری نیکی سے بڑھ کر موجود ہے، یہاں تک کہ آدمی خدا کی راہ میں شہید ہو جائے اور پھر شہادت سے بڑھ کر نیکی کا وجود ہی نہیں۔

شہید شافع ہوتا ہے

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا خداوند عالم قیامت کے دن تین گروہوں کی سفارش و شفاعت کو قبول کرے گا۔ ایک انبیاء و دوسرے آئمہ اہل ہار و علماء و مرجوان کے پیروہوں اور تیسرے شہداء۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء و آئمہ اہل ہار و علماء و مرجوان کے بعد یہ شہداء ہی جو روز قیامت شفاعت کریں گے چونکہ دنیا میں انبیاء و آئمہ و علماء و مرجوان کے بعد یہ شہداء ہی تھے جنہوں نے لوگوں کو علمت کی راہ سے نجات دی اور انہیں راہ حق کی ہدایت کی اور اسی راہ پر ہدایت کے چراغ روشن کیے۔

امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے فرمایا۔ خداوند عالم شہید کو عظمت و جلال کے نور سے آراستہ کر کے میدان جہنم میں لائے گا اور اگر انبیاء کا ان کے سامنے سے گزر ہوگا تو انبیاء ان کے احترام میں اپنی سواری سے اتر جائیں گے۔ یہ ہے مقام و منزلت شہید۔

شہید پر رونے کی تاکید

پیغمبر اکرمؐ کے دوران زندگی میں جن لوگوں نے شہادت کا شرف حاصل کیا ان میں سب سے قابل احترام جنہیں ”سید الشہداء“ کا لقب ملا حضرت حمزہ ابن عبد المطلب تھے، آپ پیغمبر کے چچا تھے اور جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

جن حضرات نے عتبات عالیہ کی زیارات کی ہیں یقیناً قبر جناب حمزہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے ہوں گے، حضرت حمزہ مدینہ میں تنہا زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ حضرت حمزہ کے گھر کے سوا تمام شہیدوں کے گھر ماتم عزاء پہا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کو یہ بات ناگوار گوری ادا پائے فرمایا: اہا حمزہ فلا یولکی لک تمام شہیدوں پر تو رونے والے موجود ہیں لیکن حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔ اس جملے کا سنا تھا کہ تمام اصحاب حضرت حمزہ کے گھر جمع ہوئے اور انہوں نے پیغمبر اکرمؐ اور حضرت حمزہ

کے احترام میں صف ماتم عزہ اچھائی اور گئیے کیا۔ اس واقعہ کے بعد مدینہ میں بدسم چنگیزی کو کوئی شہید پرونا چاہتا تو پہلے حضرت حمزہ کے گھر جا کر صف ماتم بچھاتا پھر اپنے گھر مجلس عزہ اہل بیت پر رونا کرنا۔ ان واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام اگرچہ عام میت پر رونے کو پسند نہیں کرتا لیکن شہید پر رونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ شہید کا نامہ ساز اور عالی مرتبہ کا حامل ہوتا ہے۔ شہید پر گریہ، اس کے شجاعانہ کارنامہ میں شرکت کے برابر اس کی روح کے ساتھ حرکت کا نام اس کے جذبہ عمل پر راضی ہونے کا اقدام اور اس کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہونے کے مماثل ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد شہادت امام حسینؑ نے تمام شہادتوں کو اپنی شہادت کی شفاعتوں کے تحت لے لیا اور اسی لیے ”سید الشہدا“ کا لقب آپ کو ملا، اگرچہ حضرت حمزہ بھی ”سید الشہدا“ ہیں لیکن حضرت امام حسینؑ السلام ”سید الشہدا مطلق“ ہیں۔ یعنی حضرت حمزہ ابن عبد المطلب اپنے زمانے کے سید الشہد ہیں اور امام حسینؑ علیہ السلام تمام زمانوں اور تمام ادوار کے سید الشہدا ہیں جس طرح حضرت مریمؑ عذرا اپنے زمانے کی سیدۃ النساء تھیں لیکن حضرت فاطمہؑ اور تمام زمانوں کی ”سیدۃ النساء“ ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت پہلے جس شہید پر رونا سنت تھا اور جس پر رونا اس کے شجاعانہ کارنامہ میں شرکت اور اس کی روح کے ساتھ حرکت اور اس کے جذبہ عمل پر راضی ہونے کا نام تھا وہ شخصیت حضرت حمزہؑ تھے لیکن واقعہ کربلا کے بعد یہ مقام امام حسینؑ کے لیے مخصوص ہو گیا۔

شہید پر رونے کا فلسفہ

اس مقام پر میں شہید پر رونے کے فلسفہ کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے اس دور میں بہت سے لوگ خصوصاً ہمدے نوجوان امام حسینؑ پر رونے کو پسند نہیں کرتے اور سخت اعتراض کرتے ہیں چنانچہ چند بار مجھ پر بھی اس ضمن میں اعتراض کیا گیا ہے۔

بعض افراد اپنی تقاریر و مقالات میں واضح طور سے اس روئے کے عمل کو غلط بتلاتے ہیں وہ امر شہادت پر روئے کو ایک فکر غلط اور بے معنی نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ جو معاشرے کو ضعیف اور کمزور بنا دیتا ہے۔

اپنے طالب علمی کے دور میں، میں نے محمد مسعود کی لکھی ہوئی اُس کتاب کا مطالعہ کیا تھا جس میں اُصفیوں نے امام حسینؑ پر شیعہ حضرات کے روئے کے عمل کو عیسائیوں کی طرز فکر یعنی شہادت مسیح کے روز (ان کے عقیدہ کے مطابق) جن اور خوشی منانے کے روئے سے مقابلہ و مقابلہ کیا اور لکھا کہ ایک قوم اپنے رہبر کی شہادت پر روتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک عملِ مظلومیت خود اور افسوس ناک سمجھتی ہے جبکہ دوسری قوم اپنے رہبر کی شہادت پر جشن اور خوشی مناتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک امرِ مطلوب اور افتخار آمیز تصور کرتی ہے۔ جس قوم نے شہید پر ہزار سال گریہ کیا، آہ و نالہ بپا کیئے وہ اس عمل کی وجہ سے ایک بد بخت، ڈرپوک اور میدان جنگ سے فرار کرنے والی قوم بن گئی، جبکہ دوسری قوم جس نے اپنے شہید پر دو ہزار سال سے جشن اور خوشی منائی ایک طاقتور اور فداکار قوم کہلائی۔

ایک ملت نے اپنی طرز فکر کے ذریعہ شہادت کو شکست سمجھا اور اس منفی عمل پر گریہ کیا، آہ و نالہ بپا کیئے جس کی وجہ سے وہ قوم ضعیف اور نحیف کہلائی لیکن دوسری قوم نے شہادت کو ایک عملِ مثبت اور افتخار آمیز تصور کیا اور جشن و خوشی منائی، جس کی بدولت وہ دلیر اور طاقتور کہلائی، یہ تھی وہ بحث جس کو محمد مسعود نے اپنی کتاب میں درج کیا تھا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ اس مسئلہ پر بحث کر دوں اور یہ ثابت کر دوں کہ اتفاقاً یہ تعبیر برعکس ہے۔ اگرچہ کہ اس مقام پر میں ان افراد کی طرف داری نہیں کر دوں گا جو شہادت امام حسینؑ علیہ السلام کو فقط ایک عملِ مظلومانہ اور ایک قتلِ بے گناہ سمجھ کر افسوس کرتے ہیں اور اس عمل پر گریہ کرتے ہیں۔ لیکن جن افراد نے علوم اسلامی کا مطالعہ کیا ہے اور مکتب اسلام سے واقف ہیں وہ فلسفہ گریہ کو سمجھ کر اور شہادت کی قدر و منزلت کو جانتے ہوئے عزاداری ابا عبد اللہؑ کو بپا کرتے ہیں اور

اس میں شرکت کرتے ہیں۔

اولاً مجھے اس کی خبر نہیں کہ شہادت حضرت عیسیٰؑ اور اس پر جشن و خوشی منانے کے مسائل کو کب اور کس نے ایجاد کیا، لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ دین اسلام نے شہید پر رونے کی تاکید کی ہے خصوصاً مذہب شیعہ نے۔

اب بحث کے اصلی موضوع کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی شہادت اور موت کے فلسفہ کو اس شخص یا شخصیت کی جانب سے دیکھیں۔

کیا موت اس شخصیت کے لیے ایک پسندیدہ عمل ہے اور وہ اس پر راضی ہے یا نہیں؟ دوسرے افراد اس کی موت پر رضایت کا اظہار کرتے ہیں اور اس کی موت کو ایک شجاعانہ عمل اور اس کا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں بہت سے ادیان و مذاہب انسان اور اس کے دنیا کے ساتھ رابطہ یا بالفاظ دیگر روح اور بدن کے رابطہ کو ایک زندانی اور زندان، یا ایک پرندہ اور پرندہ سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ان کی نظر میں موت آزادی اور رہائی کا نام ہے۔ بنابرین خود کشی ان مذاہب کی نظر میں فعل حرام نہیں بلکہ جائز ہے یعنی ان نظریوں کے تحت موت ایک عمل مثبت اور کامیابی ہے اور اس پر افسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ زندان سے رہائی، یا قفس سے آزادی خوشی کا باعث ہوتی ہے اور اس پر غم نہیں منایا جاتا۔

بعض افراد موت کو ایک عمل تباہی، نابودی اور فنانی تصور کرتے ہیں اور اس کے برخلاف زندگی کو ایک عمل وجودی اور ہستی کہتے ہیں۔ اور یہ ایک امر مسلم ہے کہ ہستی، نیستی پر مثبت منفی پر اور وجود تباہی پر ترجیح رکھتا ہے، یعنی ان کی نظر میں زندگی کسی بھی طرح کی ہو بہر قسم کی موت پر ترجیح رکھتی ہے اور اس نظریہ کے تحت موت سو فیصد منفی ہے۔ ایک اور نظریہ کے تحت موت تباہی اور نابودی کا نام نہیں بلکہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ اور اسی طرح سے روح اور بدن کا رابطہ پرندہ اور پرندہ یا زندانی اور زندان کا رابطہ نہیں بلکہ یہ رابطہ ایک طالب علم اور مدرسہ یا باغبان اور باغ کی طرح کا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایک طالب علم، علم کو حاصل کرنے کے لیے مصیبتیں، مشقتیں اٹھاتا ہے اور گھر سے دور وطن سے دور، غربت کے عالم میں، مدرسہ کے محدود علاقے میں رہ کر علم حاصل کرتا ہے تاکہ معاشرے میں سر بلند اور عزت و احترام کی زندگی گزار سکے اور اسی طرح ایک باغبان اپنے گھر کو چھوڑ کر صبح شام باغ میں کاشت کرتا ہے اور اسی کام کی بدولت وہ اپنے اہل و عیال کے لیے زندگی اور راحت کا سامان مہیا کرتا ہے، پس رابطہ دنیا و آخرت یا روح و بدن اسی قسم کا رابطہ ہے۔

جو افراد اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں لیکن توفیق صحیح نہ ہونے کے بنا پر اپنی تمام عمر بے بنیاد اور بے کاری میں گزار دیتے ہیں، مسلمان کسی بھی وقت موت کی آرزو نہیں کرتے، بلکہ وہ موت سے ڈرتے اور دور بھاگتے ہیں کیونکہ اپنے کیئے ہوئے اعمال سے ڈرتے ہیں۔

لیکن جن افراد نے اس نظریہ کو قبول کرتے ہوئے اپنی زندگی نیک کاموں میں صرف کی ہو اور ہمیشہ خدا کی راہ پر گامزن رہے ہوں وہ ہمیشہ موت کے شائق اور آرزو مند ہوتے ہیں، ان کے قلب ہمیشہ موت کی آرزو میں دھڑکتے رہتے ہیں۔ ان کی مثال اُس طالب علم کی سی ہے جو اپنی تعلیم کو پورا کرنے پر اپنے وطن کو پلٹنے کا شوق ہوتا ہے تاکہ اپنے دوستوں اور اپنے چاہنے والوں سے ملاقات کر سکے۔ یا اُس باغبان کی مانند ہے جو کاشت کے پورا ہونے کا بے تابی انتظار کرتا ہے تاکہ جلد از جلد اس کے شجرہ کو اپنے گھر لے جائے۔

اولیاء خدا یا دوستان خدا اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کے عمل کو موت کہتے ہیں۔ موت ان افراد کی دیرینہ آرزو ہے اور وہ بے قراری سے اس آرزو کی تکمیل کے مشتاق رہتے ہیں۔ بقول حضرت علی علیہ السلام، اگر خداوند عالم اولیاء خدا کے لئے موت کا وقت معین نہ فرماتا تو عاقبت کے خوف اور ثوابوں کے شوق میں ان افراد کی روحیں ان کے بدن سے خود بخود پرواز کر جاتیں۔

ان تمام مسائل کے باوجود اولیاء خدا موت کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں نہیں رہتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عمر ایک فرصت ہے جس میں عبادت اور عمل صالح انجام دیئے جاسکتے ہیں اور یہ فرصت جتنی بھی زیادہ ہو اتنے ہی انسانی کمالات اجاگر ہوں گے چنانچہ اسی لئے وہ طول عمر کے طالب ہوتے ہیں۔

لہذا معلوم ہوا کہ اس نقطہ نظر کے مطابق، موت کا مشتاق ہونا، موت کی آرزو کرنا، اور خداوند عالم سے عبادت کے لئے طول عمر کی دعا کرنا، کسی بھی طرح سے ایک دوسرے کے برخلاف نہیں۔

قرآن کریم ان یہودیوں کے بارے میں جو اپنے لئے خدا کا دوست (اولیاء اللہ) ہونے کا دعویٰ کرتے تھے فرماتا ہے:

”اگر تم لوگ خدا کے سچے دوست ہوتے تو موت تمہارے

لئے ایک پسندیدہ عمل اور ایک دیرینہ آرزو ہوتی، لیکن تم

لوگ ہرگز موت کی آرزو نہیں کرتے کیونکہ ظلم و جبر کے

اعمال نے جو تم لوگوں سے سرزد ہوئے ہیں تم کو اس

جہان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔

اولیاء خدا دو مقام پر طول عمر کی دعا نہیں کرتے۔ ایک جبکہ انہیں اس بات

کا یقین ہو جاتا ہے کہ اپنی کمزوری اور ضعف کی بناء پر عبادت میں خلل یا کوتاہی واقع

ہو رہی ہے حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام فرماتے ہیں :
 ”إِلٰهِيَّ وَعَمْرِي مَا دَامَ عُمُرِي بِذَلِكَ
 فِي طَاعَتِكَ فَإِذَا كَانَ مِنْ تَعَالَى الشَّيْطَانِ
 فَأَقْضِنِي إِلَيْكَ۔“

”پروردگار! مجھے صرف اتنی زندگی دے کہ تمام زندگی تیری
 عبادت میں صرف ہو جائے اور اگر قرار ہو کہ میری زندگی
 شیطان کی چراگاہ بنے تو مجھے جلد از جلد اس دنیا
 سے اٹھالے۔“

دوسرا مقام ”شہادت“ ہے جہاں ادبِ خدا طولِ عمر کی دعا نہیں کرتے، بلکہ
 ہمیشہ موت کو شہادت کی شکل میں طلب کرتے ہیں کیونکہ شہادت دو خصوصیات کی حامل
 ہوتی ہے۔ اول شہادت ایک عملِ صالح اور شجاعانہ امر ہے اور خداوندِ عالم کے
 نزدیک کوئی بھی نیکی یا عملِ صالح شہادت سے بلند تر اور آفرین تر نہیں ہے، دوسرے
 شہادت اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونے کا نام ہے جو ادبِ خدا کی دیرینہ
 آرزو ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی لیے جب حضرت علی علیہ السلام کو موت شہادت کی شکل میں نصیب
 ہوئی تو آپ خوشی سے پھولے نہ سائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ضربتِ لگنے کے
 بعد بسترِ شہادت پر کئی اہم سخن ارشاد فرمائے ہیں جو نہجِ البلاغ میں محفوظ ہیں
 فرماتے ہیں :

”وَاللّٰهُ مَا فَجَأَنِي مِنَ الْمَوْتِ وَإِذْ كَرِهْتُ
 وَلَا طَالِعَ انْكَرَتُهُ وَ مَا كُنْتُ إِلَّا كَقَارِبٍ
 وَرَدَّوْطَالِبٍ وَجَدَ“

”خدا کی قسم کوئی ناگہاں اتفاق مجھ پر نازل نہیں ہوا، مجھے وہی چیز نصیب ہوئی جس کی میں ہمیشہ آرزو و انتظار کرتا تھا (جو شہادت ہے) میری مثال اس شخص کی طرح ہے جو دات کی تاریکی میں پانی کو پانے کے لیے صحرا کے چکر لگائے اور پانی کا چشمہ اُسے نظر آجائے۔“

ایسویں رمضان کی سحر جب دشمن کی تلوار نے علی علیہ السلام کے فرقہ مبارک کو کاٹا تو آپ نے فرمایا:

”فَإِنَّ رِبَّ الْكَعْبَةِ“

”کعبہ کے پروردگار کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔“

پس معلوم ہوا شہادت اسلام کی نظر میں اس شخص یا شخصیت کے لئے نہ صرف ایک عمل پسندیدہ اور آرزو ہے بلکہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

امام عالی مقام حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام فرماتے ہیں:

”پیغمبر اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بشارت دی

کہ حسین تیرا درجہ خداوند عالم کے پاس اتنا بلند ہے کہ اُسے

شہید ہوئے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔“

پس امام حسین علیہ السلام کی شہادت، خود آپ کی شخصیت کے لئے ایک

بلند و باوقار مرتبہ جو عالی ترین درجات کا حامل ہو تصور کیا جاتا ہے۔

اس مقام تک ہم نے فلسفہ موت و شہادت پر اس شخص یا شخصیت کی جانب

سے بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر موت شہادت کی شکل میں حاصل ہو تو یہ

شہید کے لیے ایک امتیاز اور خوشی و خوشحالی کا موقع ہے۔ چنانچہ اسی لئے

سید ابن طاووس فرماتے ہیں :

”اگر ہمیں عزاداری کرنے کا دستور نہ دیا جاتا تو ہم بھی تمام
آئمہ اطہار کی شہادتوں پر جشن مناتے۔ لہذا ہم عیسائیت
کو جس کی نظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہید تصور کیے
جاتے ہیں اس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کے روز شہادت جشن اور خوشی منائے۔“

اب اسلام کی روشنی میں تصویر کے دوسرے رخ کا بھی بغور مطالعہ کریں،
یعنی شہادت کو معاشرہ کی نظر میں، یا جامہ کے افکار اور تاثرات شہید اور اس کے
کارنامہ کی بابت معلوم کریں۔

شہید اپنے اجتماع سے دو قسم کے تعلقات کا حامی ہوتا ہے۔ ایک وہ
لوگ جو اس کے چاہنے والے اور اس کے پیرو ہوتے ہیں اور شہادت کی وجہ
سے شہید کے علم و فیض سے محروم ہو جاتے ہیں اور شہادت ان افراد کے لیے ایک
عمل تاثر آور اور غم گین تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس غم و الم میں گریہ
نذاری کرتے ہیں۔

دوسرے وہ افراد جنہوں نے شہید کی آواز کو روکنے کے لیے فساد اور
تباہی کے سامان مہیا کیے اور جن سے لڑتے ہوئے شہید نے شہادت
نوش کیا اور شہید کی ناموجودگی ان افراد کے لیے یہ امر باعث خوشی اور جشن تصور
کیا جاتا ہے۔

شہادت ایک نیک عمل ہے جو ایک واقعہ بد کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔
یعنی ایک آپریشن کی طرح ہے، جو ایک بیماری بد مثلاً اپنڈیسٹ یا زخم معدہ کو
خارج کرنے کے لیے کیا جاتا ہے چنانچہ اگر اپنڈیسٹ یا زخم معدہ نہ ہو تو آپریشن

کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس مورد میں آپریشن کرنا خود ایک غلطی تصور کیا جاتا ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ شہادت سے درس حاصل کریں۔ یعنی اولاً معاشرہ میں ایسا ماحول نہ بننے دیں اور اس بات کی اجازت نہ دیں کہ چند افراد ظلم اور قتل کے علمدار کھلانے لگیں جیسے یزید اور ابن زیاد وغیرہ، جن کے نام بھی قیامت تک قابل نفرتین و ملامت رہیں گے۔

دوسرے اگر ایسا ماحول بنے کہ شہادت کی ضرورت محسوس ہو تو شہید کے دلیرانہ عمل کو (جس کو اس نے خود انتخاب کیا ہو) دوسروں تک پہنچائیں تاکہ عوام کے احساسات شہید کی فکر اور اس کے احساس سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں شہید پر گریہ کرنا اس کے دلیرانہ عمل میں شرکت اس کی روح کے ساتھ ہم آہنگی اور اس کی خوشی و اقامت سے موافقت کا نام ہے۔ اس مقام پر ہم اس مسئلہ کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا عیسائیوں کے جشن میں جو رقص آواز اور شراب خوری کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ عوام کے احساسات کو شہید (ان کے مطابق) کے احساسات سے ہم آہنگ اور ہم قدم کرتی ہیں یا گریہ کام انجام دیتا ہے۔ بعض افراد گریہ کو انسانیت سے گرا ہوا عمل یا بزدلانہ کام تصور کرتے ہیں۔ جبکہ ہنسنا اور رونانا وہ اہم خصوصیات ہیں اور حیوان ان خصوصیات سے دور ہے۔ ہنسنا اور رونانا انسان کے احساس اور احساساتی ہونے کی دلیل ہے۔ رونے کی طرح ہنسنے کے بھی کئی اقسام ہیں (جن پر میں بحث کرنا لازم نہیں سمجھتا)، آنسو بہانا، رقت کے ساتھ رونایا خوشی سے آنسو ڈل کو کون نہیں جانتا، رونانا ایک ایسا امر ہے کہ انسان روتے وقت اپنے محبوب سے نزدیک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو محبوب سے منسلک کر دیتا ہے۔ مستی اور خوشی انسان کو خود غرضی، شہوت اور لذت کی طرف لے جاتی ہے جبکہ نالہ و زاری انسان کو

اس کے محبوب سے نزدیک کر کے اس کے عشق سے سرشار کرتی ہے۔ اور انسان خودی کو بھول کر عشق حقیقی میں گم ہو جاتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنی عالی شان شخصیت اور پراستیا ز شہادت کی بناء پر لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اگر علمائے دین اور رہبران ملت اس گنج بزرگ یعنی شہادت امام حسین علیہ السلام کو عوام اور ملت کے سامنے حقیقی جلوہ دیں اور عوام کے احساسات اور ان کی رُوح کو اس شہادت سے بہت حاصل کرنے کی ہدایت کریں تو تمام دنیا سُدھر سکتی ہے۔

حسینیت کی زندگی کا اصلی راز تفکر امام حسین علیہ السلام تھا جو ایک عمل صالح اور منطقی ہونے کے علاوہ عقل کی حمایت سے کاملاً برخوردار تھا جو جذبہ عشق اور احساسات کی گہرائیوں سے جاری ہوا تھا۔

آئمہ اطہار نے امام حسین علیہ السلام پر جو رونے کی سخت تاکیدیں کی ہیں وہ حکمت اور منطق سے خالی نہیں کیونکہ یہ آنسو ہی ہیں جو قلب تک اُتر جاتے ہیں اور انسان کو متاثر کیئے بغیر خشک نہیں ہوتے۔

قبر شہید کی اہمیت

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو تبیہات پڑھنے کے لیے فرمایا (یعنی ۳۲ بار اللہ اکبر، ۳۳ بار الحمد للہ، ۳۳ بار سبحان اللہ۔ تو حضرت فاطمہ، حضرت حمزہ کی قبر پر گئیں اور آپ کی تربت کی خاک سے تیسع بنائی۔

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے یہ عمل کیوں کیا۔ اگر تیسع کے دانے

کھڑی یا معمولی مٹی کے ہوں تو کوئی فرق حاصل ہوتا ہے؟ یہ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ شہید کی قبر کی مٹی قابلِ احترام ہے۔ شہید کی قبر کا مرتبہ بلند بالا ہے۔ یہ ایک قسم کا احترام ہے جو شہید اور اس کی شہادت کو دیا جاتا ہے جو شہادت کے مقام و منزلت کو اجاگر کرتا ہے۔

واقعہ کربلا کے بعد ہم قبر حسین علیہ السلام کی خاک کو تبرک کے طور پر استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ خدا نے سجدہ کو لباسِ دفن پر جائز قرار نہیں دیا بلکہ سجدہ صرف مٹی اور پتھر پر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ ہمارے ائمہ اور علماء نے فرمایا ہے اب جبکہ سجدہ خاک پر کیا جائے تو بہتر ہے کہ یہ خاک شہید کی قبر کی خاک ہو اور اگر کربلا کی خاک مل جائے تو اس میں شہید کے خون کی بو بھی رہے گی۔ پس جبکہ ہم نماز پڑھ رہے ہوں اور ہر قسم کی خاک پر سجدہ روا ہو تو اگر ہمارا سر اس خاکِ مقدس پر ہو جو شہید کی قبر سے نزدیک اور شہید کے خون کی بو دے تو اس نماز کا ثواب سو بار بڑھ گا۔

امام فرماتے ہیں:

”سجدہ کرو میرے جدِ امام حسین علیہ السلام کی تربت پر“
کیونکہ جس نمازی نے اس تربت پر سجدہ کیا اس نے سات پردوں کو ہٹایا اور شہید کے مقام و منزلت کو پہچانا اور اس خاک نے اس کی نماز کے مرتبہ کو بلند و بالا کیا۔“

شبِ عاشورہ

آج کی رات ہم کس یئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آج کی شب کس کی شب

ہے۔ آج کی شب شبِ شہید ہے۔

ہماری دنیا کا رواج ہے کہ بعض روز بعض افراد یا گروہوں کے نام سے موسوم اور مخصوص ہیں مثلاً روزِ مادر، روزِ استاد وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم نے اسلام کے سوا کہیں نہیں دیکھا کہ ایک روز شہید کے نام سے بھی موسوم ہو۔ اسلام نے ایک دن کو شہید کے لیے مخصوص کیا اور وہ روزِ روزِ عاشور ہے اور آج اس کی شبِ شبِ عاشور ہے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں شہید کے فلسفہ یا شہید کی منطق کے دو پہلو ہیں۔ ایک شہید کا عشقِ الہی سے منسلک ہونا اور دوسرا اس کی شہادت کی بدولت اجتماع کی خدمت کرنا۔ یعنی اگر ان دو شخصیتوں زاہد اور مصلح کو ایک جگہ جمع کریں تو ایک شہید و مجدد میں آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر شخصیت ”مسلم ابن عوسجہ“ حبیب ابن مظاہر، ”نُصَیر ابن قتیبہ“ وجود میں آتی ہے۔ اگرچہ تمام شہیدوں کے درجات و مراتب جُدا جُدا ہیں۔

امام حسینؑ نے اصحاب و اہلبیتؑ پر اپنی حجتِ تمام کی

جب نویں محرم کو یہ بات طے پائی کہ دوسری کی سحر حق اور باطل کے درمیان جنگ و معرکہ کا پیغام لائے گی اور صرف ایک شب کی مہلت باقی رہ گئی ہے تب امام حسین علیہ السلام نے اپنے تمام اہل بیت اور اصحاب کو جمع کیا۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ جس خیمہ میں ان افراد کو جمع کیا گیا تھا وہ خیمہ میرے خیمہ سے متصل تھا۔ چنانچہ آپ کے قول کے مطابق امام نے ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ کی فصاحت و بلاغت و منطق سے سرشار تھا۔

پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی اور فرمایا:

أُشْنِي عَلَى اللَّهِ أَحْسَنَ الثَّنَاءِ وَ أَحْمَدُهُ عَلَى السَّرائِ
وَالضَّرَاءِ اللَّهُمَّ إِنِّي أَحْمَدُكَ عَلَى
أَنْ أكرمْتَنَا بِالتُّبُّوَّةِ - وعلمتنا القرآن
و فقهتنا في الدين "

"میں خدا کی حمد و ثناء میں مشغول ہوں جو عالی ترین عبادت
ہے۔ میں نے ہمیشہ خدا کی شکر گزاری کی ہے اور اب بھی
ہر حال میں اور ہر مقام پر اس کا شکر گزار ہوں۔ یہ ایک
حقیقت ہے کہ جو افراد راہِ مستقیم پر گامزن ہوں، ہر مقام
پر اور ہر حال میں خدا کے شکر گزار اور اس سے راضی رہتے ہیں۔
یہ لوگ اپنے وعدہ کے پختے ہوتے ہیں اور اپنے وعدہ کو
پورا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے اور اس راہ میں
آئی ہوئی ہر مشکل کا غشی سے استقبال کرتے ہیں "

فرزدق اپنے زمانے کا ایک مشہور شاعر تھا، جب اس نے عراق اور کوفہ
کے حالات کو امام کے لئے نامناسب اور خطرناک بتلایا۔ تب امام نے فرمایا:
"ان نزل القضاء بما نُحِبُّ فَنَحْمَدُ اللَّهَ
على نعمائه وهو المستعان على اداء
الشكر و ان حال القضاء دون الرجاء
فلم يتعد (فلم يبعد) من سکان الحق نيتہ
والتقوى سریرتہ

”اگر حالات نے ہماری خواہش کے مطابق رخ اختیار کیا تو ہم اللہ کی حمد و ثنا کریں گے اور اس کا شکر ادا کرنے کے لئے اُس سے مدد چاہیں گے اور اگر حالات مساعد نہ ہوئے تب بھی ہم گھٹے میں نہیں رہیں گے کیونکہ ہماری نیت نیک ہے اور ہمارا ضمیر صاف ہے۔ پس جو کچھ بھی پیش آئے وہ خیر ہے شر نہیں۔ ہم تمام حالات میں خواہ وہ خوشگوار ہوں یا نہ ہوں، اللہ کے شکر گزار ہیں۔“

امام علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں اچھے بُرے دونوں قسم کے دن دیکھے رکھے ہیں۔ اچھے دن وہ تھے جب میں رسولِ اکرمؐ کی گود میں بیٹھتا تھا اور ان کے کندھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں ساری دنیا میں سب سے زیادہ چہنیا بچہ تھا۔ ان دونوں کے لئے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں موجودہ مشکلات کے لئے بھی اس کا شکر گزار ہوں کیونکہ میں انھیں بُرا نہیں سمجھتا بلکہ خیر سمجھتا ہوں۔

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں اور اپنے اہل بیتؑ کے بارے میں تاریخی گواہی دی۔ آپ نے فرمایا :

”إِنِّي لَا أَعْلَمُ أَصْحَابًا خَيْرًا وَلَا أَوْفَى مِنْ أَصْحَابِي وَلَا أَهْلَ بَيْتٍ أَبْرَ وَلَا أَوْصَلَ وَلَا أَفْضَلَ مِنْ أَهْلِ بَيْتِي“

”مجھے اپنے اصحاب سے بہتر اور زیادہ وفادار کسی اصحاب کا علم نہیں اور نہ ہی میں کوئی اعزہ و اقربا جانتا ہوں جو میرے اعزہ و اقربا سے زیادہ نیک اور زیادہ فرض شناس ہوں۔“

یہ فسر ماکر آپ نے اپنے ساتھیوں کو رسول اکرمؐ کے اُن صحابہ سے افضل قرار دیا جو آنحضرتؐ کے ہمراہ جنگوں میں شریک ہوئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور انہیں اپنے والد بزرگوار امام علیؑ کے ان ساتھیوں سے بھی افضل قرار دیا جنہوں نے جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں داعی اجل کو لبیک کہا کیونکہ آپ کے ساتھیوں کے حالات ان لوگوں سے زیادہ سخت تھے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے کسی ایسے اعزہ واقربا کا علم نہیں جو میرے اعزہ واقربا کے بلند مقام اور رتبے کا اعتراف کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ نے فرمایا :

”حاضرین! میں اپنے ساتھیوں اور عزیزوں سمیت آپ سب کو بتا دیتا ہوں کہ ان لوگوں (دشمن کی افواج) کو میرے علاوہ کسی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ مجھے اپنا واحد دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے ہیں۔ اگر میں نہ رہتا تو یہ تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔

تم نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ اب میں نہیں تمہارے عہد سے آزاد کرتا ہوں۔ تم اگر یہاں رہنے کے پابند نہیں ہو۔ تمہیں کوئی دوست یا دشمن مجبور نہیں کر رہا۔ تم قطعاً آزاد ہو۔ تم میں سے جو کوئی جانا چاہے جاسکتا ہے۔“

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا :

”تم لوگ میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑو اور چلے جاؤ۔“ امام حسینؑ کے اعزہ میں چھوٹے بڑے دونوں قسم کے لوگ شامل تھے

علاوہ انیس وہ یہاں اجنبی تھے۔ لہذا امام علیہ السلام یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سب کے سب اکٹھے روانہ ہو جائیں۔ اسی لئے آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑیں اور میدانِ جنگ سے نکلیں۔

یہ واقعہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں کے بلند کردار پر روشنی ڈالتا ہے انہیں کسی قسم کی کوئی مجبوری نہ تھی۔ دشمن کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ امام علیہ السلام نے انہیں ان کی ذمہ داری سے آزاد کر دیا تھا۔ ان حالات میں جو ایمان افروز جوابات امام حسینؑ کے اصحاب اور اعزہ نے فرداً فرداً آپ کو دئے وہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے کچھ اقتباسات نیچے درج کئے جاتے ہیں:

شہید کی شجاعت

روز عاشور اور شب عاشور امام حسینؑ یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہے تھے کہ سب کے

سب کم سن بچے سے لے کر سب سے بڑے شخص تک آپ کے سب قریبا آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

آپ کے لئے ایک اور مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ آپ کے کسی ساتھی نے بھی رتی بھر کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ ان میں سے کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر دشمنوں سے نہیں جا ملا۔ اس کے برعکس وہ کئی ایک مخالفین کو اپنی طرف لے آئے۔ ایسے لوگ عاشور کے دن اور اس سے پہلی رات کو آکر ان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ انہیں میں ایک حُر بن یزید ریاحی تھے۔

شب عاشور جو لوگ آکر امام کے ساتھیوں میں شامل ہوئے ان کی تعداد تیس تھی۔ یہ چیز امام علیہ السلام کے لئے بڑی اطمینان بخش تھی۔ امام حسینؑ کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے آپ سے عرض کیا:

آفا! کیا آپ ہیں اجازت دے رہے ہیں کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے قتلے میں ہماری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔“

اُن میں سے ایک نے کہا:-

”میں چاہتا ہوں کہ میں مارا جاؤں اور میرا بدن جلا کر میری راکھ بکھیر دی جائے اور یہ عمل آپ کی خاطر ستر بار دہرایا جائے۔ ایک بار قتل ہونا تو کوئی چیز ہی نہیں۔“

ایکٹ اور نے کہا:-

”میں چاہتا ہوں کہ میں مسلسل ہزار دفعہ قتل کیا جاتا میں چاہتا ہوں کہ میری ہزار جاں ہوں جنہیں میں آپ پر نکچا کر دیتا۔“

پہلے شخص جنہوں نے یہ الفاظ کہے امام کے دلا اور بھائی حضرت ابو الفضل العباسؑ تھے۔ ان کے بعد باقی سب اسی طرح کے جملے دہرائے۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

بھی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہ اُن کی آخری آزمائش تھی جب سبھی اپنے فیصلے کا اظہار کر چکے تو امام علیہ السلام

نے انہیں بتایا کہ دوسرے دن کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا:-

”میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ کل تم سب شہید ہو جاؤ گے۔“

اُن سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ انہیں اس بات کا موقع مل رہا ہے کہ دوسرے دن فرزند رسولؐ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

یہاں کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اگر سوال شہید کی منطبق کا نہ ہوتا تو یہ

کہا جاسکتا تھا کہ ان لوگوں کا کہ بلا میں ٹھہرنا بیکار تھا۔ اگر امام حسینؑ کو بہر حال قتل ہونا ہی تھا تو ان لوگوں کو جانیں قربان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ حضرات کیوں وہاں ٹھہرے ہیں امام حسینؑ نے انہیں ٹھہرنے کی اجازت کیوں دی؟ انہیں کیوں مجبور نہ کیا گیا کہ وہ چلے جائیں انہیں کیوں نہ کہا کہ کسی کو تم سے سروکار نہیں اور تمہارے یہاں ٹھہرنے کا ہمیں بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا واحد نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی اپنی جانیں گنوا بیٹھو گے لہذا تمہیں چلے جانا چاہئے تمہارا جانا واجب ہے اور یہاں رکن حرم ہے۔ اگر ہم جیسا کوئی شخص نام حسینؑ کی جگہ ہوتا اور شرع کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور تسلیم اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ لکھتا کہ میرا فیصلہ یہ ہے تمہارا یہاں مزید رکن حرم اور جانا واجب ہے اور اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو اس گھڑی کے بعد تمہارا سفر گناہ ہوگا اور تمہیں قصر کی بجائے پوری ناز پر بھیجا جائے لیکن امام حسینؑ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کے برعکس انہوں نے ان لوگوں کی جانیں قربان کر دینے پر آمادگی کا خیر مقدم کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شہید کی منطق دوسرے لوگوں کی منطق سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک حق پرست مجاہد اپنی جان کی قربانی اس لئے دیتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کر سکے۔ معاشرے کو روشن خیال بنا سکے۔ اس میں نئے سرے سے جان ڈال سکے اور اس کے بدن میں تازہ خون داخل کر سکے۔ یہ ایک ایسا ہی موقع تھا۔

شہادت کا واحد مقصد دشمن کو شکست دینا نہیں ہوتا۔ یہ جوش و خروش بھی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس میں امام حسینؑ کے ساتھ اپنی جانیں نثار نہ کر دیتے تو اس جوش و خروش کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ گو شہادت کے واقعے میں امام حسینؑ علیہ السلام مرکزی شخصیت کے حامل تھے لیکن ان کے ساتھیوں کی شہادت نے خود ان کی شہادت کی شان و شوکت اور وقار میں اضافہ کیا۔ ممکن تھا کہ ان کی شرکت کے بغیر امام حسینؑ کی شہادت کو

اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی کہ لوگ اس سے متاثر ہوں، سبق سیکھیں اور سینکڑوں بلکہ
ہزاروں سال تک بھوش اور ولولے سے سرشار ہیں۔
آخر میں ہم اللہ تعالیٰ کے پائیاں لطف و کرم میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور آپ کو دعوت
دیتے ہیں کہ دعا کریں کہ وہ پروردگار عالم ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اپنی خوشگشت کو اس
کی مرضی کے تابع کر دیں اور ہم اپنی برکتیں نازل کرے اور اپنی راہ میں شہادت کا تہیہ کرے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

(سورۃ الشعراء آیت ۲۷۷)

jabir.abbas@yahoo.com